قربانی اور فلسفۂ قربانی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

دنیا کا نظام جن الٰہی قوانین پر قائم ہے ان میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ اشیا کو اُن کے کمالات کی طرف ترقی دینے میں، جس طرح مبدءِ افیاض کی طرف سے علی قدرِ مراتب، جود و بخشش کا فیضان ہوتا ہے، اُسی طرح خود اشیا کو بھی کمال کے ہر نئے مرتبے میں اپنے پچھلے مرتبے کے لوازم اور مالوفات و مرغوبات کو قربان کرنا پڑتا ہے اور اس قربانی کے بغیر تحصیلِ کمالات کے سفر میں وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ بخار کو پانی بننے کے لیے اپنی آزادی اور ہوائیت کو قربان کرنا پڑتا ہے، اور وہ تقیدات قبول کرنا ہوتے ہیں جو مائیت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پانی کو برف بننے کے لیے پھر اپنی رہی سہی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، اپنے بہت سے آبی خواص کی قربانی دینی ہوتی ہے، تب جا کر اُسے پتھر کی سی سختی اور شیشے کی سی صفائی اور چمک میسر ہوتی ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ بخار کے لیے حالت بخار میں رہتے ہوئے اور ہوا کی سی آزادی و لطافت رکھتے ہوئے وہ کمالات بھی جمع ہو جائیں جو صورتِ مائیہ کے ساتھ مخصوص ہیں، اور وہ کمالات بھی جو برف کے لیے مقدر کیے گئے ہیں۔

یہ سنت اللہ ہے جس میں کوئی استثنا اور تغیر و تبدل نہیں، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (الفتح ۴۸:۲۳)۔ تمام مخلوقاتِ عالم پر یہی قانون جاری ہے، اور سب کی طرح انسان بھی اسی کے زیر اثر ہے۔ نطفہ اپنی صورتِ نطفیہ کو قربان کر کے صورتِ انسانیہ حاصل کرتا ہے، بچہ اپنے بچپن کو قربان کر کے جوانی حاصل کرتا ہے، اور جوان اپنی جوانی کھو کر بڑھاپے کی بزرگی حاصل کرتا ہے۔ پھر زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں ترقی کرنے اور اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کے لیے انسان کو کچھ نہ کچھ قربانیاں نہ دینی پڑتی ہوں۔ بڑائی اور بزرگی کا دامن ہر میدان میں قربانی اور ایثار کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک بڑے فائدے کے لیے بہت سے نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں، ایک بڑی لذت کے لیے بہت سی تلخیاں گوارا کرنی پڑتی ہیں، ایک اعلیٰ مرتبے کے لیے بہت سے اُن مزوں کو ہاتھ سے دینا پڑتا ہے جو ادنیٰ مراتب میں حاصل تھے۔ جس علامہ کی جلالتِ علمی پر آپ رشک کرتے ہیں اُس سے پوچھیے کہ اس نے کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں اور کتنا خونِ جگر تحقیق و اکتشاف کی راہ

میں کھپایا ہے؟ جس مَلِکُ التُّجّار کی دولت کو دیکھ کر آپ کے منہ میں پانی بھرا آتا ہے اس سے پوچھیے کہ روپیہ کمانے کی جدوجہد میں کس طرح اس نے دن کے آرام اور رات کے چین کو اپنے اُوپر حرام کرلیا ہے؟ جس مدبّرِ سلطنت کے اقتدار اور شان وشوکت کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں' اس سے پوچھیے کہ اسے کتنی کش مکش' کتنی پریشانیوں' کتنی ٹھوکروں' اور کتنی روحانی وجسمانی اذیتوں کے بعد اس مقام تک پہنچنا نصیب ہوا ہے؟ غرض زندگی کا کوئی میدان لے لیجیے' ہر جگہ آپ یہی دیکھیں گے کہ کمال اور ترقی کا ہیولیٰ لذتوں کے خون سے تیار ہوتا ہے اور کمال کے مراتب جتنے بلند ہوتے ہیں' ان کے لیے قربانیاں بھی اتنی ہی زیادہ درکار ہوتی ہیں۔

دنیوی کمالات سب کے سب جزئی کمالات ہیں' اس لیے وہ قربانیاں بھی صرف جزئی چاہتے ہیں۔ دنیوی کمالات جتنے ہیں سب مادّی ہیں یا ان میں مادّے کی آمیزش ہے' اس لیے وہ قربانیاں بھی ایسی ہی چاہتے ہیں جو مادّی قسم کی ہوں یا مادّے سے لگاؤ رکھتی ہوں۔ دنیوی کمالات کا مقصود نفس یا تعلقاتِ نفس کے لیے فوائد کا حصول ہوتا ہے' لہٰذا ان کے لیے صرف وہ چیزیں قربان کی جاتی ہیں جو نفس اور اس کے محبوبات ومطلوبات سے ماسوا ہیں۔ مگر کمالِ حقیقی کا معاملہ سب سے جداگانہ ہے۔ یہ کلّی کمال ہے' قربانی بھی کلّی چاہتا ہے۔ مادّے سے مجرد ومنزہ ہے' اس لیے جسم کی نہیں نفس وروح کی قربانی چاہتا ہے۔ گو ظاہری شکل کے اعتبار سے اس کے لیے بھی بہت سی ایسی قربانیاں دینا پڑتی ہیں جو مادّی قسم کی ہیں' یا مادّے سے لگاؤ رکھتی ہیں' لیکن دراصل وہ مادّے کی قربانیاں نہیں ہیں بلکہ ان محبتوں' ان دل چسپیوں' ان لذتوں اور ان علائق کی قربانیاں ہیں جو انسانی روح اس دنیا کی مادّی اشیا کے ساتھ رکھتی ہو۔ اس کمال کا مقصود نفس یا تعلقاتِ نفس نہیں' بلکہ حق ہے' اس لیے وہ خود نفس کی قربانی چاہتا ہے' اور بشرطِ ضرورت نفس کے ساتھ ہر وہ شے اس کے لیے قربان کرنی پڑتی ہے جو نفس کو مرغوب ہو۔

یہی نکتہ ہے جسے قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (اٰل عمرٰن ۳:۹۲)

یعنی تم نیکی کے مقامِ رفیع تک پہنچ نہیں سکتے جب تک کہ وہ چیزیں نہ خرچ کرو جنھیں تم عزیز ومحبوب رکھتے ہو۔ یہ مِمَّا تُحِبُّوْنَ کا لفظ اتنی وسعت رکھتا ہے کہ جان' مال' اولاد' رشتہ دار' دوست' وطن' قوم' عزت' شہرت' ہر دلعزیزی' لذت ومسرت' عیش وآرام' عقائد وافکار' حریتِ خیال وآزادیِ عمل' غرض ہر محبوب شے اس میں داخل ہے' اور ان سب چیزوں کو مِمَّا تُحِبُّوْن کے دائرے میں لے کر حکم لگایا گیا ہے کہ اگر تم 'نیکی' کے اعلیٰ مراتب تک پہنچنا چاہتے ہو' تو تمھیں حق کی خاطر ان میں سے ہر چیز قربان کرنا پڑے گی۔ حق سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس سے محبت رکھو وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (البقرہ ۲:۱۶۵) جو چیز تمھارے دل میں اتنا گھر کر

لے گی کہ اس کی محبت' حق کی محبت سے بڑھ جائے اور حق کے مقابلے میں تم اس کو عزیز رکھنے لگو' وہی بت ہے' صنم ہے' بنائے شرک و کفر ہے' نیکی کے مقام تک پہنچنے میں وہی سنگِ راہ ہے۔ اس کمال کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلی ضرب اِسی بت پر لگاؤ اور اسے پاش پاش کر کے حق کی محبت کو سب محبتوں پر غالب کر دو۔

غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں اوّل سے لے کر آخر تک جو کچھ ہے قربانی ہی قربانی ہے۔ اسلام میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے' انسان کو آزادیِ فکر و آزادیِ عمل کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ 'اسلام' لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اب آپ اس کے لیے آزاد نہیں ہیں کہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں اور جو راہِ عمل پسند کریں اس پر چلنے لگیں بلکہ آپ کا کام وہ اعتقاد رکھنا ہے جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے' اور ان احکام و قوانین کے مطابق چلنا ہے جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر کر دیے ہیں:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ،(الاعراف ۷:۳)

جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تمھاری جانب اُتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر ان کی پیروی نہ کرو جن کو تم نے دوست بنا لیا ہے۔

یہ 'اسلام' یا 'نیکی' کے راستے میں پہلا قدم ہے' اور اسی پر اتنی بڑی قربانی دینی پڑتی ہے کہ اچھے اچھے اِسی مقام پر ڈگمگا جاتے ہیں۔ یہاں زندگی کے ہر شعبے میں حلال اور حرام کے حدود ہیں' خبیث اور طیب کے امتیازات ہیں' فرائض و طاعات ہیں' حقوق و واجبات ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر کیا ہے۔ داعیاتِ نفس قدم قدم پر انسان کو اِثم و عُدوان کی طرف کھینچتے ہیں' مگر اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ حدود اللہ پر نفس کی ساری خواہشوں کو بھینٹ چڑھاؤ' لذتوں کا خون کرو' فائدوں کو قربان کر دو۔ یہ تقویٰ اور پاکیزگی کی راہ بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس پر ایک قدم بھی انسان اپنے جذبات و داعیات' اپنے لطف اور اپنے فوائد کی قربانی دیے بغیر نہیں چل سکتا۔ فضل و احسان کا مقام تو بہت بلند ہے' فرائض و واجبات کے ٹھیک ٹھیک بجالانے میں حقوق کو پوری طرح ادا کرنے' اور گناہ کے راستوں سے بچ نکلنے ہی میں نفس پر کچھ کم جبر نہیں کرنا پڑتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا' یہ تو صرف پہلا ہی قدم ہے' یہ پورا اسلام نہیں ہے' بلکہ اسے محض اسلام میں داخلے کا امتحان سمجھیے۔ اسلام صرف یہی نہیں ہے کہ آپ نماز پڑھیں' روزہ رکھیں' بشرطِ استطاعت حج اور زکوٰۃ ادا کریں' معاصی سے محترز رہیں اور حقوق ادا کرتے رہیں' بلکہ اسلام کی اصلی روح یہ ہے کہ آپ حق کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز رکھیں اور جب موقع آئے تو کسی چیز کو بھی حق پر فدا کر دینے میں دریغ نہ کریں۔ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ ایک طرف حق ہو اور اس کے ساتھ جان و مال کا زیاں ہو' مصیبتیں اور تکلیفیں ہوں' رسوائیاں اور ٹھوکریں ہوں' اور دوسری طرف باطل ہو' اور اس کے ساتھ عیش و آرام ہو' لطف و مسرت ہو' اور ہر طرح کے فائدے ہوں' تو

مسلمان وہی ہے جو حق کے پہلو کو اختیار کرے اور اس کی خاطر ان سب مصائب کو بخوشی برداشت کر لے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ لا قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (البقرہ ۲:۱۵۵-۱۵۶)

ہم ضرور تم کو کچھ خوف اور بھوک اور جان و مال اور ثمرات کے زیاں سے آزمائیں گے اور (اے نبیؐ) تو ان صبر کرنے والوں کو بشارت دے دے جن پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پھرنا ہے۔

اگر کسی وقت خود اپنے باپ بھائی، اہلِ خاندان اور دوست، حق کے دشمن ہو جائیں تو مسلمان وہی ہے جو حق کے لیے ان سب کو چھوڑ دے اور کسی سے تعلق نہ رکھے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ۔ (المجادلہ ۵۸:۲۲)

تو کوئی قوم ایسی نہ پائے گا جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے محبت بھی رکھے، چاہے وہ دشمنانِ خدا اور رسولؐ ان کے باپ یا بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

اگر کسی وقت قوم اور وطن کی حق سے دشمنی ہو جائے تو مسلمان وہی ہے جو حق کی خاطر قوم سے قطع تعلق کر لے اور وطن کو خیرباد کہہ دے، ورنہ اس کو منافق کہا جائے گا خواہ وہ کیسا ہی نمازی پرہیزگار ہو:

فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (النساء ۴:۸۹)

تم ان کو ہرگز دوست نہ بنانا جب تک کہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔

اگر کسی وقت دشمنانِ اسلام کے خلاف جنگ کی ضرورت پیش آ جائے تو مسلمان وہی ہے جو سر ہتھیلی پر لے کر مرنے اور مارنے کے لیے نکل آئے اور حق کی خاطر جان قربان کر دینے میں ذرا دریغ نہ کرے۔ جس نے اس موقعے پر کوتاہی کی، اس کا دعوئ اسلام جھوٹا ہے خواہ کتنا ہی بڑا عابد و زاہد کیوں نہ ہو۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا (اٰل عمرٰن ۳:۱۶۶-۱۶۷)

جس روز دونوں جماعتوں کی مُڈبھیڑ ہوئی، اس دن تم پر جو مصیبت آئی وہ اللہ کے حکم سے تھی اور اس لیے تھی کہ مومنوں اور منافقوں کا فرق معلوم ہو جائے۔

غرض اسلام کچھ نہیں ہے مگر حق پر فدا ہو جانے اور ہر عزیز سے عزیز شے فدا کر دینے کا ایک عاشقانہ جذبہ۔ جس شخص میں یہ جذبہ موجود نہ ہو، جو شخص حق کے مقابلے میں جان یا مال، یا اولاد، یا ملک و قوم، یا کسی اور دنیوی چیز کو عزیز رکھتا ہو، اس کا اسلام ادھ موا بلکہ بے جان ہے۔

قرآن مجید میں طرح طرح سے اس سچی اسلامی روح کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اسی غرض کے لیے پچھلی اُمتوں کے انبیا اور صالحین کے فداکارانہ واقعات کو مؤثر پیرائے میں دہرایا گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو حق کی طرف بلاتے ہیں، سالہا سال بلکہ قرنہا قرن تک شدید مصائب برداشت کرتے ہیں اور جب وہ نہیں مانتی تو خدا سے عرض کرتے ہیں کہ خدایا! ان کافروں میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑ، رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (نوح ۷۱:۲۶)۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹا غرق ہوتا ہے، بیوی ہلاک ہوتی ہے، مگر ایمان میں ذرا فرق نہیں آتا۔ حضرت لوط علیہ السلام اپنی بدکار قوم کو چھوڑ کر ہجرت اختیار کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی طرف بلایا جاتا ہے اور قید و ذلت کی دھمکی دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ مجھے گناہ کے مقابلے میں قید زیادہ محبوب ہے، رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ (یوسف ۱۲:۳۳)۔ فرعون کے ساحر حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد بے تکلف اعلان کر دیتے ہیں کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (الاعراف ۷:۱۲۱-۱۲۲) ''ہم پروردگارِ عالم پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون کا خدا ہے''۔ فرعون ان کو سخت عذاب دے کر ہلاک کر دینے کی دھمکی دیتا ہے تو وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ط اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (طٰہٰ ۲۰:۷۲) ''تجھے جو کچھ کرنا ہے کر گزر۔ تیرا حکم تو بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے''۔ اصحابِ کہف اپنی قوم کے مذہب سے علانیہ تبرّی کرتے ہیں کہ ہم خداوندِ ارض و سما کو چھوڑ کر کسی کی عبادت نہ کریں گے، رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا (الکہف ۱۸:۱۴) ''اور جب قوم کے راستے سے ان کا راستہ الگ ہو جاتا ہے تو گھر بار عزیز اقارب سب کو چھوڑ کر ایک غار میں جا بیٹھتے ہیں''۔

ان سب سے بڑھ کر حضرت ابراہیمؑ کی فداکاریاں تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ فرمایا ہے۔ انھوں نے حق کی خاطر وہ سب کچھ قربان کیا جو دنیا میں ایک انسان کو عزیز ہو سکتا ہے۔ باپ دادا کے مذہب کو چھوڑا اور صاف اعلان کیا کہ تمھارے معبودوں سے مجھے کچھ سروکار نہیں، اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (الزخرف ۴۳:۲۶) قوم اور سلطنت اور خود اپنے باپ سے دشمنی مول لی۔ ان کے بتوں کو توڑا، قوم نے ان کو آگ کا عذاب دینا چاہا تو انھوں نے آگ کے گڑھے میں گرنا قبول کیا مگر حق کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ پھر اپنے باپ، اپنے خاندان اور اپنی قوم سب کو چھوڑ کر وطن سے تن بہ تقدیر نکل کھڑے ہوئے اور سب سے کہہ دیا کہ ہمارا

اب تم سے کچھ تعلق نہیں، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی ہوگئی تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ، كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (الممتحنہ ۶۰:۴)۔ یہ سب محبتیں قربان کر دینے کے بعد ایک محبت باقی رہ گئی تھی جو حق کی محبت کے پہلو بہ پہلو دل میں جاگزیں تھی۔ حکم ہوا کہ اس بت کو بھی توڑو۔ خواب میں دکھایا گیا کہ اپنے ہاتھوں اپنے عزیز بیٹے کو جو بڑھاپے کی لکڑی تھا، ذبح کر رہے ہیں۔ حضرتِ حق آزمانا چاہتے تھے کہ یہ دوستی کا مدعی اولاد کی محبت کو بھی ہماری محبت پر قربان کرتا ہے یا نہیں، مگر وہ سچا مسلمان اس آزمایش میں بھی پورا اُترا۔ اس کا دعویٰ عشق سچا تھا۔ جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، بیداری میں بھی کر دکھانے پر آمادہ ہوگیا۔ اس طرح جب حق کی محبت پر ساری محبتیں قربان ہوگئیں، تب بارگاہِ خداوندی سے اپنے اس بندے کو ایمان کی سند دی گئی اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۱۱) اور اسے نوعِ بشری کا امام بنایا گیا اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ ۲:۱۲۴)۔ اور تمام عالم کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تمھارے لیے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی زندگی ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِىْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (الممتحنہ ۶۰:۴)۔

عیدالاضحیٰ کا تہوار اسی روح کو سال بہ سال تازہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ قربانی کی ظاہری شکل، جانور پر چھری چلانا، اس کا خون بہانا فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے، بلکہ ان ظاہری اعمال سے دراصل اس سب سے بڑی قربانی کی یاد تازہ کرنا مقصود ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محبوبِ حقیقی کے لیے دی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ فعل عبث ہے، ایک جانور کو ذبح کر دینے سے کیا فائدہ؟ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ مہذب قومیں جو بڑے بڑے آدمیوں کے مجسمے نصب کرتی ہیں اور ان کی برسیاں مناتی ہیں، ان سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ یہی نا کہ ان ظاہری علامتوں سے ان کے کارناموں کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کی تقلید کا جذبہ دلوں میں زندہ ہوتا ہے۔ بس یہی فائدہ اس قربانی کا بھی ہے۔ خدا کو جانور کا گوشت پوست اور اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ وہ ایثار و فدویت کی روح اس کو عزیز ہے جو اس کے پاک بندے ابراہیمؑ کے رگ و پے میں جاری و ساری تھی، اور وہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان میں یہی روح پیدا ہو، ہر مسلمان اسی طرح اپنی تمام محبتوں کو حق کی محبت پر قربان کرنے کے لیے آمادہ رہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج ۲۲:۳۷) اللہ کو ان کے گوشت اور ان کے خون نہیں پہنچتے بلکہ اسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

('اشارات'، ترجمان القرآن، جلد ۳، عدد ۶، ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ، فروری ۱۹۳۴ء، ص ۲-۱۰)